ناولٹ، پہلا حصہ

رمانہ عمر

حلب میری بالکنی سے

ارض مقدس شام انبیاء کی سرزمین ہے۔ قرآن پاک میں جس زمین کو" الارض المبارکۃ" کہا گیا ہے کہ وہ آج کے اردن، فلسطین، لبنان اور سیریا پر مشتمل خطہ ارض ہے۔ ماضی میں یہ ایک ہی ملک "البلاد الشام" یا (LEVANT) تھا۔ موجودہ ملک سیریا کی سرحد شمال میں ترکی، مغرب میں لبنان، مشرق میں عراق اور مغرب میں فلسطین اور بحیرہ روم سے ملتی ہیں۔ اس کی تاریخ چار ہزار قبل مسیح تک جاتی ہے۔

دارالحکومت دمشق ہے اور حلب (ALEPPO) سب سے بڑا شہر ہے جسے وکی پیڈیا کے مطابق مسلسل آباد شہروں میں دنیا کا قدیم ترین شہر قرار دیا گیا ہے۔ دمشق بنی امیہ اور مملوک سلاطین کے زمانے سے دارالخلافہ رہا لہٰذا قدیم طرز تعمیر کی بے شمار عمارتیں موجودہ تباہی سے قبل تک موجود تھیں۔

24 اکتوبر 1945ء میں یعنی پاکستان کے قیام سے دو برس قبل سیریا نے فرانس کے قبضے سے نجات حاصل کی۔ سال بھر کے اندر فوجی انخلا تو ہو گیا مگر بدقسمتی سے آزادی کے بعد بھی آزادی کی نعمت نہ مل سکی اور پارلیمانی نظام قائم نہ ہو سکا۔ 1970 میں موجودہ بشار الاسد کے باپ حافظ الاسد نے مارشل لاء حکومت قائم کی۔ ایمرجنسی لاء اور ڈکٹیٹر شپ کی ملی جلی شکل میں باپ نے 1970ء سے 2000ء تک حکومت کی پھر بیٹے نے مسند اقتدار سنبھال لیا اور گیارہ سال مطلق العنانی قائم رکھنے کے بعد عرب بہار سے خوفزدہ ہو کر اپنے ہی ہم وطنوں پر ہتھیاروں کی باڑ کھول دی۔ خانہ جنگی نے روز افزوں شدت اختیار کی یہاں تک کہ جب 2016ء کا سورج غروب ہوا تو دمشق، حلب اور دیگر شہر کھنڈر کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ملک شام میں جاری خانہ جنگی میں بشار الاسد کی وفادار فوجوں کے علاوہ ایران سے فنڈ حاصل کرنے والی" حزب اللہ" اور روسی ملیشیا نے بھی بقدر توفیق حصہ ڈالا۔ دوسری طرف بشار کے مزاحمتی مسلح گروپس بھی اتنی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے کہ بین الاقوامی سطح پر صورتحال کو سمجھنا کسی کے بس میں نہیں رہا۔ گھاگ قسم کے سیاسی تجزیہ نگار بھی شام کی جنگ کو کثیر المفاداتی جنگ کہتے رہے کہ جس کا مقصد انتہائی گنجلک ہے اور ہدف کے بارے میں خود مارنے والوں کو علم نہیں ہے کہ وہ کسے، کیوں اور کب تک ماریں گے۔

زیر نظر افسانہ دراصل وہ خون آشام حقیقت ہے جو کروڑوں کے اوپر گزر گئی۔ جب دل کے اندر دکھ حد سے بڑھ جاتا ہے تو لکھاری قلم اٹھاتا ہے۔ وہ اپنا کرب، اپنی تکلیف قاری کے سپرد کر دیتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آج امت حبیب کا ہر صاحب ایمان مرد و عورت اسی تکلیف سے گزر رہا ہے۔ بچپن میں جب ہم نے نسیم حجازی کے تاریخی ناول پڑھے تھے تو الحمرا، قرطبہ، بیت المقدس، ہاتھ سے نکل جانے پر آنسو گراتے ہوئے سوچا کہ کاش اس دور میں ہم موجود ہوتے تو ضرور" کچھ" کرتے تب کہاں علم تھا کہ ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے سیریا تباہ ہو جائے گا، مسجد بنو امیہ کے صحن کے ملبے پر گن بردار فوجی اپنے جوتوں سمیت داخل ہو جائینگے۔ تیرہ سو سال سے جاری اذان اور نماز بند ہو جائے گی اور ہم" کچھ" نہیں کر پائیں گے۔ ہم تماش بین بن جائیں گے اور اس سانحے کی تصویریں بنائیں گے ہم سب اپنے اپنے گھروں میں چین کی نیند سوئیں۔ گے اور اس خطے کو عالمی استعمار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ بقول اقبالؒ

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

(رمانہ عمر)

پہلا باب

وطنی (میرا وطن)

''مریم..... مریم..... یلا یا مریم۔''

تیسری پکار پر وہ چونکی اور پلٹ کر دیکھا تو لیلیٰ غصیلی شکل بنائے اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں کب سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں''

''میں..... یہ سننے رک گئی تھی۔ کتنا خوبصورت نغمہ ہے۔''

''وطنی۔ یا جبل الغیم الازرق

وطنی۔ یا قمر الندی و الزنبق.....

انت القوی انت الغنی و أنت الدنی یا وطنی

ترجمہ: (آخری مصرع)

اے میرے وطن..... تم بہت مضبوط، خزانوں کے حامل اور (ہمارے دلوں) سے بہت قریب ہو۔

سنٹرل پارک میں ایک گٹار سٹ دنیائے عرب کی مشہور مغنیہ ''فیروز'' کا مشہور نغمہ بجا رہا تھا اس کی آواز اور نغمے کے سحر نے گویا مریم کو جکڑ ہی لیا تھا۔ وہ بھول گئی کہ ابی اور لیلیٰ کب کے جا چکے تھے اور اب لیلیٰ اسے ڈھونڈتی ہوئی واپس آئی تھی۔ نغمے کے سحر سے نکل کر وہ لیلیٰ کے ساتھ واپسی کے لئے پلٹی۔

ایک طرف فوارے کے اردگرد بچے کھیل رہے تھے تو دوسری طرف کتنے ہی خاندان جا بجا قالین بچھائے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہر قالین پر انواع واقسام کے شامی کھانے اور قہوہ سے بھرے تھرماس ضرور موجود تھے۔ جس جانب جھولے تھے وہیں باربی کیو کی گرلز لگی ہوئی تھیں ہوا کا جھونکا آتا تو کوئلے پر گوشت بھننے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتی۔

لیلیٰ اور مریم پارک کی روش پر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آس پاس کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک بچے کے ہاتھ سے غبارہ چھوٹا اور دھیرے دھیرے ہوا میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ جب تک لیلیٰ کچھ سوچتی مریم نے دوڑ کر غبارے کی ڈور پکڑ لی۔ پھر مسکرا کے بچے کے پاس گئی اور اسکے گالوں پر ہلکی سی تھپکی دے کر غبارہ اسے پکڑا دیا۔ بچے کی ماں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا:

''اگر یہ اڑ جاتا تو میرا بیٹا یہیں زمین پر لیٹ کر رونا شروع کر دیتا۔ یہ بڑا ضدی ہے۔''

مریم نے مسکرا کر کہا:

''بچے ایسے ہی ہوتے ہیں اور غبارہ..... یہ تو ان کے لئے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔''

جب وہ دونوں گاڑی تک پہنچیں تو لیلیٰ نے مریم کے کان میں کہا

''تم کو بچے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے تمہارے دس سے کم بچے نہیں ہوں گے مگر مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ ہم عربوں کے اتنے سارے بچے ہوتے ہی کیوں ہیں؟''

مریم اس بات پر ہنس دی۔ پھر بولی:

''اس لئے کہ عرب عورت نئے آنے والے بچے اور گھر آنے والے مہمان کو کھلے دل سے اهلاً و سهلاً کہتی ہے اسی لئے اسے خوب سارے بچوں اور ڈھیر سارے مہمانوں سے نوازا جاتا ہے۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہی دونوں نے فرمائش شروع کر دی۔

''بوضة شامية، بوضة شامية'' (شام کی مخصوص آئسکریم)

باپ نے مسکراتے ہوئے گاڑی العلب القديمه (پرانے شہر) کی جانب موڑ لی ''الاسواق القديمة'' میں ہی ان کی یہ پسندیدہ آئسکریم ملتی تھی۔

وہ بچپن سے اس بازار میں آ رہی تھیں۔ یہاں پر پھیلی مسالوں کی خوشبو سونگھتے ہی انہیں بچپن کے بہت سے معصوم قصے یاد آ جاتے پرانے طرز کی عمارت پر مشتمل یہ بازار گلیوں در گلیوں پھیلا ہوا تھا۔ ہر دو جانب مٹی کی دیواروں والی چھوٹی چھوٹی دکانیں اور گاہکوں تاجروں کا شور۔ کہیں رقم پر بحثا بحثی ہو رہی ہے تو کہیں قہقہے بلند ہو رہے ہیں کہیں راہداری میں مل بیٹھ کر قہوہ کا دور چلایا جا رہا ہے۔ یہاں کے دکاندار بھی جدید بازاروں کے برعکس بڑے ٹھنڈے مزاج کے تھے۔ ہر بچے کو پیار

کرتے اور کوئی نہ کوئی چیز ''ہدیہ'' کہہ کر
بوضة شامية کو پسند کرنے کی
ساتھ وہ شو بھی تھا جو اسے بناتے وقت
ڈوئی جیسی شکل کا ڈنڈا جسے آئسکریم بنا
آئسکریم کے گہرے کنٹینر پر متواتر مار
طرح لپٹ جاتا تو کون میں بھر بھر کر پک
مخصوص میز پر بیٹھے آئسکریم سے لطف
ذکر چھیڑ دیا، جب مریم ابن بازار میں
پاگلوں کی طرح اسے آوازیں دیتے ڈھ
الطيور'' (پرندوں کی مارکٹ) کی جا
ہاتھوں پر بٹھانے کی مشق کر رہی تھی۔
واپسی کے سفر میں گاڑی کا شیشہ
میٹھی ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ا
لٹوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے کی کو
نے ایک سریلی تان اڑائی:
وطنی یا وطنی ..... یا جبل
پھر اس کی آواز میں لیلیٰ نے اپنی
آتا تھا مگر وطنی والا بند بلند آواز میں گا لیا
شامل کر لی تو ایک سماں ہی بندھ گیا۔
مریم نے چاروں جانب دوڑ۔
ہوئے سوچا ''یا حلبی یا حلوتی'' (اے حلب
☆.....☆
''چلو جی چھٹی ہوئی۔ امتحانات
گھومنے کا پلان بناتے ہیں۔'' لیلیٰ اپ
دوسری جانب پھینک، صوفے پر ہی پاؤں
''یا لیلیٰ، کتنی بار کہا ہے گھر آ کر س
کر پاؤں دھویا کرو پھر صوفے پر انہیں پھ
مریم نے مخصوص تنبیہی انداز سے ک

کرتے اور کوئی نہ کوئی چیز ''ہدیہ'' کہہ کر بلا قیمت پکڑا دیتے تھے۔

بوضتہ شامیہ کو پسند کرنے کی وجہ سے اس کے ذائقے کے ساتھ ساتھ وہ شو بھی تھا جو اسے بناتے وقت کیا جاتا تھا۔ قریباً چالیس پاؤنڈ کا ڈوئی جیسی شکل کا ڈنڈا جسے آئسکریم بنانے والا میوزک کی تھاپ کی طرح آئسکریم کے گہرے کنٹینر پر متواتر مارتا رہتا۔ پھر جب پستہ خوب اچھی طرح لپٹ جاتا تو کون میں بھر بھر کر پکڑاتا جاتا۔ وہ تینوں آج بھی اپنی مخصوص میز پر بیٹھے آئسکریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ لیلیٰ نے وہ ذکر چھیڑ دیا، جب مریم اس بازار میں گم ہو گئی تھی پھر جب ابی اور لیلیٰ پاگلوں کی طرح اسے آوازیں دیتے ڈھونڈتے پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ ''سوق الطیور'' (پرندوں کی مارکٹ) کی جانب نکل گئی تھی اور ایک طوطے کو ہاتھوں پر بٹھانے کی مشق کر رہی تھی۔

واپسی کے سفر میں گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے وہ دونوں ٹھنڈی میٹھی ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور اپنے ریشمی بھورے بالوں کی لٹوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے کی کوشش بھی ساتھ جاری تھی کہ مریم نے ایک سریلی تان اڑائی:

وطنی یا وطنی ..... یا جبل الغیم الازرق

پھر اس کی آواز میں لیلیٰ نے اپنی آواز شامل کر لی۔ اسے پورا تو نہ آتا تھا مگر وطنی والا بند بلند آواز میں گا لیتی تھی۔ پھر ابی نے بھی اپنی آواز شامل کر لی تو ایک سماں ہی بندھ گیا۔

مریم نے چاروں جانب دوڑتے بھاگتے مناظر پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا ''یا حلبی یا حلوتی'' (اے حلب اے پیارے حلب)

☆.....☆.....☆

''چلو جی چھٹی ہوئی۔ امتحانات سے تو نجات ملی۔ اب کہیں گھومنے کا پلان بناتے ہیں۔'' لیلیٰ اپنا بیگ ایک جانب اور جوتے دوسری جانب پھینک، صوفے پر ہی پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔

''یا لیلیٰ، کتنی بار کہا ہے گھر آ کر سب سے پہلے ہاتھ منہ اور خاص کر پاؤں دھویا کرو پھر صوفے پر انہیں پھیلاؤ''

مریم نے مخصوص تنبیہی انداز سے کہا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ لیلیٰ پر اس جملے کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے برابر میں پڑا میگزین اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔

''ویسے میں تو کہیں جانے کے موڈ میں نہیں۔ میرا کینوس، میرے برش اور میرے سارے رنگ مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔ میں تو اب پینٹنگ کروں گی۔'' وہ تولیہ لیے باہر آتے ہوئے بولی۔

''اگر اتنا ہی پینٹنگ کا شوق تھا تو کلیۃ الطب (میڈیسن) کے لئے کیوں اپلائی کر رہی ہو؟ فنون (آرٹس) لے لیتیں۔''

لیلیٰ نے میگزین سے نگاہیں اٹھا کر اس سے جرح کی۔

''طب میرا پیشہ ہوگا تو مصوری میرا شوق۔ میں دونوں کو نہیں چھوڑوں گی۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بالکونی کا دروازہ کھول کر چند گہرے گہرے سانس لیے۔

''کتنے دنوں سے میں بالکونی میں نکلی تک نہیں۔ پتہ ہے لیلیٰ مجھے بچوں کی رونق، اسکول کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور یہاں کی ہوا سب سے عشق ہے۔''

یہ کہتے کہتے اچانک ایک انوکھا خیال اس کے ذہن میں کوندا اور اس نے چٹکی بجائی۔

''عندی فکرہ جیدۃ'' (مجھے بڑا اچھا خیال آیا)

کہتی ہوئی وہ بھاگی اور الماری سے سارا سامان لا کر اسٹینڈ سیٹ کر لیا کینوس چڑھایا اور ڈبوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے مریم کی آواز آئی۔

''ارے بھئی کپڑے تو تبدیل کر لو۔ کھانا کھا لو۔ تھوڑا ریلیکس کر لو ایسی بھی کیا جلدی ہے کام کرنے کی؟''

اس نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''کام؟ تم کو یہ کام لگتا ہے مگر میرے لئے امتحانات کے پریشانی ختم ہونے کے بعد آرام و سکون پانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں''

اور پھر تیسرے دن وہ لیلیٰ اور ابی کی آنکھوں پر پٹی چڑھائے ان کے سامنے اپنی آئل پینٹنگ سیٹ کر رہی تھی۔

''ہاں اب بالکل ٹھیک ہے۔ اب کھول لیں۔'' وہ معصومانہ خوشی

سے بولی۔

ان دونوں نے آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو واقعی حیران رہ گئے۔ لیلیٰ اور مریم کے کمرے کی بالکونی سے نظر آنے والا منظر ہو بہو ویسا ہی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ کینوس پر گویا اتار دیا گیا تھا۔

ان کا کمرہ تیسری منزل پہ تھا جہاں سے بالکل سامنے پرانے طرز کے بنے ہوئے فلیٹس نظر آتے جن کی بالکنی پر سوکھنے کے لئے کپڑے لٹکے ہوتے۔ دکانوں کی قطار میں موجود کیفے اور اس کے سامنے کرسیاں اور میز جن پر بیٹھے قہوہ پیتے باتیں کرتے لوگ اور پارکنگ میں چند گاڑیاں۔ دائیں جانب کو بڑی روڈ اور اسکے پار اسکول کی بلڈنگ جس کی پیشانی پر" مدرسة سيدة الفرح الخاصة- مرحلة التعليم الاساسي- روضة ' کا بورڈ۔ کھلے ہوئے گیٹ سے نظر آتی مدرسے کی سیڑھیاں اور اس سے ملی ہوئی چرچ کی عمارت جس کی چوٹی پر جڑا صلیب کا نشان عمارتوں کے پیچھے دور افق پر ڈوبتا سورج اور اس کی سنہری کرنوں سے پھیلتی روشنی کا حسین سماں مریم نے یہ سب کچھ اس مہارت سے کینوس پر منتقل کیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں واقعی دنگ رہ گئیں اسے باپ سے ہمیشہ کی طرح ڈھیروں ستائش ملی۔ انہوں نے اسے پاس بلا کر دیر تک اسکا منہ چوما پھر نقد انعام۔ ہاتھ میں پکڑا کر کہا'' جیسے چاہو خرچ کرو۔''

مریم نے اس تصویر کی فوٹو اپنے موبائل سے بنا کر اس کے نیچے لکھا" حلب كمار ايتها من شُرفتِي"(حلب میری بالکنی سے)

اور اسے پینٹنگ کے سالانہ مقابلے کے لئے بھیج تو دیا لیکن بھیجتے وقت اسے اس بات کی قطعاً امید نہ تھی کہ وہ اول انعام کی حقدار قرار پائے گی۔ پھر جب اسے دو ہزار سیرین پونڈ کا انعام ملا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔

☆......☆......☆

یوں تو مریم اور لیلیٰ دونوں جڑواں تھیں مگر شکل اور عادات میں یکسر مختلف۔ مریم کم گو اور سنجیدہ مگر لیلیٰ کھلنڈری اور فرفر بولنے والی تھی۔ بچیوں کی پیدائش کے بعد ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں کہ بیک وقت دو جانوں کو اس دنیا کے حوالے کرنے والی خود دوسرے جہاں سدھار گئی۔

باپ نے دہری ذمہ داری نبھاتے ہوئے دونوں کو پروان چڑھایا اور بہترین تعلیم دلوائی۔ شفقت و نرمی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ان کے پاس محبت ایک خزانے کی مانند تھی جسے انہوں نے بیوی کے چلے جانے کے بعد بیٹیوں پر جی بھر کے لٹایا۔ دوستوں میں اٹھنے بیٹھنے اور سیریا کے عام مردوں کی طرح خوش گپیوں کا انہیں قطعاً شوق نہ تھا۔ چمڑے کے جوتوں کی تجارت سے وابستہ تھے اور اس کے بعد جتنا وقت بچتا وہ اپنی کتابوں میں سر چھپا کر گزار دیتے تھے۔

مریم نے کتب بینی کا شوق باپ سے ورثے میں ہی پایا تھا۔ اولیول کی سخت پڑھائی شروع ہونے سے قبل ہی وہ عربی اور انگریزی ادب کے تمام کلاسکس چاٹ چکی تھی۔ تاریخ اس کی دلچسپی کا خاص مضمون تھا اور'' البلاد الشام'' کی تاریخ تو اسے ازبر تھی۔ اس دن بھی وہ باپ کے کتب خانے کی جھاڑ پونچھ ہی کر رہی تھی کہ اچانک ایک نادر نسخہ اس کے ہاتھ لگا۔ تاریخ اسلام کی نامور شخصیتوں پر مشتمل'' تربانی'' کی کتاب'' مائة من عظماء امة الاسلام '' اس کے ہاتھ آئی تو وہ جھاڑ پونچھ بھول کر اسی میں کھوگئی۔

رات میں ابی کے ساتھ قہوہ کی مجلس جمی تو اس کا موضوع '' صلاح الدین ایوبی'' تھا۔

'' ابی آپ کو پتہ ہے اب میرا ہیرو کون ہے؟'' اس نے چمکتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے سوال کیا۔

'' کون؟'' باپ نے بھی اتنے ہی اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔

'' صلاح الدین ایوبی۔ فاتح فلسطین و فاتح بیت المقدس'' اس نے جذب سے کہا۔

'' واللہ مریم تم سال میں دو بار تو اپنے ہیرو ضرور ہی بدلتی ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک روز تم اپنے اصل ہیرو کا باضابطہ اعلان کر ہی دو'' لیلیٰ نے قہوہ دانی سے قہوہ انڈیلتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔

'' تو اس میں میرا کیا قصور؟ ہماری تاریخ میں ایک سے بڑھ کر ایک قد آور مرد موجود ہے۔ جس کے بارے میں پڑھتی ہوں وہی

مجھے ہیرو لگنے لگتا ہے۔'' اس نے رو

" كلامك صحيح يا مر
الرائعة"

(یہ تو سچ ہے ہماری تاریخ
ہوئے ہیں۔)

ابی نے اس پر تعریفی نگاہ ڈ
آج کے مطالعے کے بارے میں پو
کارنامے بتانے لگی۔

اچانک ہی وہ ایک خیال
میں بولی:

'' ابی بعض انسانوں کا پیدا
ہے۔ سوچتی ہوں اگر صلاح الدین
فرق ہوتا۔ شائد ہم کبھی بیت المقدس
کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب
برطانوی فوج کے جرنیل نے صلاح
اس نے کہا تھا:

'' اٹھو صلاح الدین دیکھو ہم
یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی اور اپن

(د

جب

'' دیکھو میری عزیزہ میری
اپنی بچیوں کو بھیج رہا ہوں۔ یہ پہلا مو
نے انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں

'' میں جانتی ہوں اخی آپ فک
بیٹیاں ہیں۔''

'' وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم خو

'' میری مجبوری ہے ورنہ ضرو
گی۔ میں انہیں خوب گھماؤں پھراؤ

مجھے ہیرو لگنے لگتا ہے۔''اس نے روہانسی صورت بنا کر کہا۔

"کلامك صحیح یا مریم ۔ تاریخنا مَلِیءٌ بالشخصیات الرائعة"

(یہ تو سچ ہے ہماری تاریخ کے ایام بلند شخصیتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔)

ابی نے اس پر تعریفی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا پھر اس سے اس کے آج کے مطالعے کے بارے میں پوچھا تو وہ خوشی خوشی صلاح الدین کے کارنامے بتانے لگی۔

اچانک ہی وہ ایک خیال کے آنے پر چونکی اور کھوئی کھوئی آواز میں بولی:

''ابی بعض انسانوں کا پیدا ہونا اس زمین کی خوش قسمتی بن جاتا ہے۔سوچتی ہوں اگر صلاح الدین پیدا نہ ہوتا تو ہماری تاریخ کا رنگ کتنا فرق ہوتا۔شائد ہم کبھی بیت المقدس حاصل نہ کر پاتے۔آپ کو پتہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ارض مقدسہ پر برطانیہ کا قبضہ ہوا تو برطانوی فوج کے جرنیل نے صلاح الدین کی قبر پر لات مار کر کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا:

''اٹھو صلاح الدین دیکھو ہم یہاں تک پہنچ گئے۔''

یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی اور اپنا سر باپ کے کندھے سے ٹکا لیا۔

(دوسرا باب)

جب دمشق زندہ تھا

''دیکھو میری عزیزہ میری بہن میں تم پر مکمل بھروسہ کر کے ہی تو اپنی بچیوں کو بھیج رہا ہوں۔یہ پہلا موقع ہے اور تم جانتی ہو کہ آج تک میں نے انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔''

''میں جانتی ہوں اخی آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔وہ میری بھی تو بیٹیاں ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم خود آ جاتیں تو اچھا ہوتا......''

''میری مجبوری ہے ورنہ ضرور آتی اور بچیاں یہاں بور نہیں ہوں گی۔میں انہیں خوب گھماؤں پھراؤں گی۔ویسے آپ بے فکر ہو جائیں انہیں سارے روایتی کھانے سکھا کر ہی واپس بھیجوں گی۔''

یہ لیلیٰ اور مریم کی پھوپھی تھیں جو دمشق میں رہتی تھیں یونیورسٹی میں داخلے اور پڑھائی کا بوجھ پڑنے سے قبل ہی لیلیٰ اور مریم کو دو ماہ کے لئے ان کے پاس بھیجا جا رہا تھا۔باپ نے تو انہیں یہی بتایا تھا کہ پھوپھی تمہارے لئے اداس ہیں اور گھمانا پھرانا چاہتی ہیں مگر اصل مقصد یہ تھا کہ ماں کے بغیر پلنے کی وجہ سے ان میں جن صلاحیتوں کی کمی رہ گئی ہے وہ پوری کی جا سکے۔

لیلیٰ اور مریم جب سامان سے لدی پھندی حلب سے دمشق پہنچیں تو پھوپھی دونوں ہاتھ پھیلائے استقبال کو موجود تھیں،

"اھلاً و سھلاً۔ لقد اشتقت الیکما کثیرا۔ انا سعیدة جدا بوجود کما۔"

وہ دیر تک دونوں کو بار بار چومتی رہیں۔پھر اگلے دو ماہ میں پھوپھی سے انہیں اتنی محبت اور اپنائیت ملی کہ وہ تو سرشار ہی ہو گئیں۔

دمشق کا یہ سفر ان کی زندگی کا یادگار ترین سفر ثابت ہوا۔پھوپھی بھتیجیاں کبھی سنٹرل مال میں ہوتیں تو کبھی پرانے طرز کے بازاروں الاسواق القدیمہ میں گھومتیں۔ پھوپھی ایک ملنسار خاتون تھیں اور پھر خدمت خلق کی بھی شوقین تھیں۔ان کا حلقہ احباب اتنا وسیع تھا کہ آئے دن دعوتیں ہوتی رہتیں۔یہاں دونوں نے ملنے جلنے کا سلیقہ بھی سیکھا اور بڑوں میں اٹھنے بیٹھنے سے خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا۔

پھوپھی خود ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھیں۔ان کی موجودگی میں کسی گائڈ کی ضرورت نہ رہتی تھی۔ جمعہ کے دن وہ تینوں ''الجامع الاموی''میں جمعہ پڑھنے جاتیں پھوپھی نے بتایا کہ یہ مسجد خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں تعمیر کی گئی تھی جو 705 عیسوی یعنی 86 ہجری کا زمانہ تھا۔اس کے دالان میں اموی دور کی تعمیرات کی نشانی گول چبوترا تھا جس پر گنبد تھا۔مریم نے نماز ختم کر کے چاروں جانب نگاہ دوڑائی تو اسے ابی کی کتابوں میں پڑھی کہانیوں کے کردار اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

یہاں خلیفہ کا خطبہ ہوتا ہوگا۔ یہاں پر مجاہدین صفیں بنائے سر

جھکائے کھڑے ہوتے ہوں گے۔ وہ جو گھوڑوں کی پیٹھ پر اکڑ کر بیٹھنے کے عادی تھے یہاں آکر سجدہ ریز ہوجاتے ہوں گے۔ اس مسجد میں امت کے لئے کتنی ہی دعائیں مانگی گئی ہوں گی۔ وہ سوچتی گئی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ لیلیٰ کے بار بار پکارنے پر ہی چونکی تھی۔ پھر شرمندہ شرمندہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیلیٰ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سمجھ نہیں آتی کہاں چلی جاتی ہو؟''

''تاریخ کے سفر پہ'' اس نے دھیرے سے کہا اور چل پڑی

☆.....☆.....☆

پھوپھی کو وہ دونوں عمتی کہہ کر بلاتی تھیں۔

کھانا پکانے کا وقت آتا تو وہ اپنائیت اور محبت سے آواز لگاتیں۔

''حان وقت الطبخ تعالا لتسا عدانی فی عمل الغداء''

(چلو پکائی کا وقت شروع ہوگیا۔ آجاؤ دونوں میرے ساتھ ذرا دوپہر کے کھانے میں مدد کروادو)

''آج حمص، تبولا اور کبہ بنائیں گے''

''چلو تم لوگوں کو اپنے ہاتھ کا ورق عنب کھلاتی ہوں''

''جس دسترخوان پر شیش تاؤوک نہ ہو اس میں رونق ہی نہیں ہوتی۔'' اس طرح کے جملے کہتی وہ ہاتھ چلاتی جاتیں۔

وہ سارے کام خود کرتی تھیں مگر لڑکیوں کو ساتھ ساتھ لگائے رکھتی تھیں یہاں تک کہ زیتون کا تیل کب اور کتنا ڈالا جائے، یہ بھی دکھاتیں۔ لیلیٰ اور مریم نہ صرف ذہین تھیں بلکہ سیکھنے میں بھی مہارت رکھتی تھیں اس لئے ذائقے کی لطافت، مسالوں کی کثرت اور کھانوں کی وسعت کے باوجود وہ سیریا کے روایتی کھانوں کے رازوں کو پا گئیں اور اچھی کک ثابت ہوئیں۔ پھوپھی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ جب ان کے ابی انہیں لینے آئیں گے تو وہ دونوں اپنے ہاتھوں سے سارے کھانے بنا کر دسترخوان سجائیں گی۔

اُس روز بھی مریم باورچی خانے میں چولہے کی جانب رخ کئے کھڑی تھی اور کٹنگ بورڈ پر اس کی چھری بڑی مہارت سے چل رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بغیر مڑے کہا:

''لیلیٰ تیل کی نئی بوتل تو کھول دو۔''

چند ثانیے انتظار کے بعد وہ پیچھے کو مڑی تو دھک سے رہ گئی وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا اور محویت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ مریم نے بدحواسی میں چھری کاؤنٹر پر پٹخی اور دروازے سے باہر دوڑ لگا دی۔ بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ پھوپھی کا بیٹا بسام تھا تو وہ دیر تک شرمندہ رہی۔ بسام کی تصویریں اس نے پھوپھی کے البم میں دیکھی ضرور تھیں مگر وہ کبھی آپس میں ملے نہیں تھے۔

کھانے کی میز پر بسام نے اسے چھیڑا:

''لیلیٰ یہ تمہاری بہن تو بڑی ڈرپوک ہے۔ مجھے چور سمجھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔''

لیلیٰ نے چہک کر بہن کی حمایت کی:

''ڈرپوک کیوں ہوتی، غلطی آپ کی ہے۔ آپ کو پہلے بتانا چاہیے تھا۔ اب ہمیں کیا خبر تھی کہ اس ویک اینڈ آپ کی سواری تشریف لانے والی ہے۔''

''خیر میرا تو یہ گھر ہے جب جی چاہے آؤں جب چاہے جاؤں مگر یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں میری ماں کو کب تک بور کرتی رہوگی۔ میں نے سنا ہے مہمان صرف تین دن کا ہوتا ہے۔'' اس کی یہ بات لیلیٰ کو ذرا اچھی نہ لگی وہ منہ پھلا کر بولی:

''ٹھیک ہے آپ ہی کا گھر ہے۔ کہہ دیجئے کہ چلی جاؤ تو ہم آج ہی ٹکٹ لے لیں گی۔''

اس بات پر مریم نے تنبیہ نظروں سے اسے گھورا اور پھوپھی کی طرف متوجہ ہوکر بولی:

''لیکن ہم تو عمتی کی مہمان ہیں جب تک وہ چاہیں گی ہم یہیں رہیں گی۔''

☆.....☆.....☆

دمشق سے واپسی ان دونوں کے لئے خوشی کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی اداسی کے احساسات لئے ہوئے تھی۔ خوشی تھی اپنے شہر اپنے باپ کے پاس جانے کی تو اداسی پھوپھی کی مسحور کن شخصیت سے دوری کی تھی۔

پھر دمشق کا سحر ایسا تھا جو کہ ہر آنے وا
کی ہریالی، سڑکوں کی دونوں جانب لگے
بازار، پرشکوہ مساجد اور کلیساؤں کی عما
دوڑتی بھاگتی زندگی۔ غرض زندگی کا کون
گیا تھا۔ لیلیٰ اور مریم نے وعدے کے عی
ایک روز پہلے سے سارے کھانے کا بندو
ایک طرف ''شوار ما'' تھا جسے رو
گیا تھا تو دوسری طرف بوغل اور گوشت
کے کباب موجود تھے۔ گوشت سے بنے
اور برغل سے بنائے گئے ''کبہ'' سیریز
پورے اہتمام سے سجائی گئی تھیں۔

حمص، فتوش، تبولہ، محشو الفلفل (
ورق عنب میز کی رونق بڑھا رہے تھے۔

مل جل کر کھانے سے محبت کی جو فضا
ہے۔ مریم نے محسوس کیا کہ آج اس کے با
وہ پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ جہاں اپنی
تھے وہیں اس پر بھی مطمئن تھے کہ ان کی
لیا۔

بسام ایک روز قبل ہی گھر آیا تھا۔
بیروت'' (اے، یو، بی) کا طالب علم تھا
کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد مجلس لگی اور قہو
بھرنے کے لئے باورچی خانے میں اٹھ کر
آیا۔

''تو تم لوگ کل چلی جاؤ گی۔'' اس
''یقیناً ویسے بھی ہم وہ مہمان نہیں
زبردستی رکے رہیں۔'' اس نے کمال خوبی
ہوئی بات پلٹائی۔

پھر دمشق کا سحر ایسا تھا جو کہ ہر آنے والے کو خود بخود ہی جکڑ لیا کرتا۔ اس کی ہریالی، سڑکوں کی دونوں جانب لگے اونچے اونچے درخت، بارونق بازار، پرشکوہ مساجد اور کلیساؤں کی عمارتیں، سڑکوں پر ہمہ وقت ایک دوڑتی بھاگتی زندگی۔ غرض زندگی کا کون سا روپ تھا جو دمشق کو عطا نہ کیا گیا تھا۔ لیلیٰ اور مریم نے وعدے کے عین مطابق اپنے باپ کی آمد سے ایک روز پہلے سے سارے کھانے کا بندوبست شروع کر دیا۔

ایک طرف ''شوار ما'' تھا جسے رول کی صورت میں لپیٹ کر سجایا گیا تھا تو دوسری طرف بوغل اور گوشت سے بنایا برغل پلاؤ تھا۔ تین طرح کے کباب موجود تھے۔ گوشت سے بنے ہوئے ''سجوک'' اور کباب حلبی'' اور برغل سے بنائے گئے ''کبہ'' سیرین کوزین کی روایتی سلادیں بھی پورے اہتمام سے سجائی گئی تھیں۔

حمص، فتوش، تبولہ، محشو الفلفل (بھر کر بنائی گئی شملہ مرچ) اور ورق عنب میز کی رونق بڑھا رہے تھے۔

مل جل کر کھانے سے محبت کی جو فضا بنتی ہے وہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے۔ مریم نے محسوس کیا کہ آج اس کے باپ کے چہرے پر جو رونق ہے وہ پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ جہاں اپنی بہن کے خاندان میں آ کر خوش تھے وہیں اس پر بھی مطمئن تھے کہ ان کی بہن نے ان کے کہے کا مان رکھ لیا۔

بسام ایک روز قبل ہی گھر آیا تھا۔ وہ ''الجامعة الامريكية فی بيروت'' (اے، یو، بی) کا طالب علم تھا اور کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد مجلس لگی اور قہوے کا دور چلا۔ مریم قہوہ دانی کو بھرنے کے لئے باورچی خانے میں اٹھ کر آئی تھی کہ وہ بھی چپکے سے چلا آیا۔

''تو تم لوگ کل چلی جاؤ گی۔'' اس نے بات شروع کی۔

''یقیناً ویسے بھی ہم وہ مہمان نہیں جو میزبان کی چاہت کے بنا ہی زبردستی رکے رہیں۔'' اس نے کمال خوبصورتی سے بسام کو اسی کی کہی ہوئی بات پلٹائی۔

''خیر وہ تو مذاق تھا۔ اچھا ہوا جو تم دونوں آ گئیں۔ امی بہت اکیلی ہو گئی تھیں مگر آج کل تو وہ بہت خوش رہتی ہیں۔''

''عمتی بہت اچھی ہیں۔ مجھے ان میں ماں کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ وہ آپ کی ماں ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔

اور بسام کھڑا سوچتا رہ گیا کہ وہ اس سے کیا کہنے آیا تھا؟ کیا واقعی وہ اس سے کچھ کہنے آیا تھا؟

2008ء کے موسم گرما میں جب لیلیٰ اور مریم اپنی پیاری پھوپھی ان کو الوداع کہہ کر دمشق سے لوٹ رہی تھیں تو پلٹ پلٹ کر شہر پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آج کے بعد کبھی وہ اس زندہ، جیتے جاگتے اور دھڑکتے ہوئے شہر کو اس حال میں نہ دیکھ پائیں گی۔

☆.....☆.....☆

حلب واپس آتے ہی مریم نے جامعة الحلب کے ''الكلية الطب'' (میڈیسن) میں اور لیلیٰ نے ''الكلية الصحافية'' (جرنلزم) میں داخلہ لے لیا۔

صبح و شام پڑھائی کے نام ہوئے۔ وہ صبح کی گئی دوپہر بعد لوٹتی تھیں تو ڈھیروں اسائنمنٹ ساتھ ہوتے۔ باپ اپنی بیٹیوں کے چہرے دیکھنے کو ترس گئے۔ لیکن زندگی کا ایک ایسا معمول بھی تھا جو اب تک جاری تھا اور وہ تھا الاسواق القديمة میں جا کر آئسکریم کھانا۔ جمعرات کی رات وہ تینوں حلب کی سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہے ہوتے۔ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے اور بوضة شامية کھا کر گھر واپس آتے۔ پھر تاریخ کا وہ منحوس ترین دن بھی آ پہنچا جب 3 جون 2011ء ''حما'' شہر کے چوراہے پر غیر مسلح اور پرامن مظاہرین پر مسلح فوجیوں کی جانب سے کھلی فائرنگ کی گئی۔ سڑک پر گری لاشوں اور تڑپتے زخمیوں کو اٹھانے نہیں دیا گیا اور مظاہرین کے انخلا تک فائرنگ کی جاتی رہی۔ 14 جنوری 2012 کے دن بشار الاسد کی تقریر کے خلاف ''ادلب'' میں زبردست مظاہرہ ہوا اور تاریخ میں پہلی بار ڈکٹیٹر کے خلاف عوام کا غم و غصہ

پھر دمشق کا سحر ایسا تھا جو کہ ہر آنے والے کو خود بخود ہی جکڑ لیا کرتا۔ اس کی ہریالی، سڑکوں کی دونوں جانب لگے اونچے اونچے درخت، بارونق بازار، پرشکوہ مساجد اور کلیساؤں کی عمارتیں، سڑکوں پر ہمہ وقت ایک دوڑتی بھاگتی زندگی۔ غرض زندگی کا کون سا روپ تھا جو دمشق کو عطا نہ کیا گیا تھا۔ لیلیٰ اور مریم نے وعدے کے عین مطابق اپنے باپ کی آمد سے ایک روز پہلے سے سارے کھانے کا بندوبست شروع کر دیا۔

ایک طرف ''شوارما'' تھا جسے رول کی صورت میں لپیٹ کر سجایا گیا تھا تو دوسری طرف بوغل اور گوشت سے بنایا برغل پلاؤ تھا تین طرح کے کباب موجود تھے۔ گوشت سے بنے ہوئے ''سجوک'' اور کباب حلبی'' اور برغل سے بنائے گئے ''کبہ'' سیرین کوزین کی روایتی سلادیں بھی پورے اہتمام سے سجائی گئی تھیں۔

حمص، فتوش، تبولہ، محشو الفلفل (بھر کر بنائی گئی شملہ مرچ) اور ورق عنب میز کی رونق بڑھا رہے تھے۔

مل جل کر کھانے سے محبت کی جو فضا بنتی ہے وہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے۔ مریم نے محسوس کیا کہ آج اس کے باپ کے چہرے پر جو رونق ہے وہ پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ جہاں اپنی بہن کے خاندان میں آ کر خوش تھے وہیں اس پر بھی مطمئن تھے کہ ان کی بہن نے ان کے کہے کا مان رکھ لیا۔

بسام ایک روز قبل ہی گھر آیا تھا۔ وہ ''الجامعة الامريكية فی بيروت'' (اے، یو، بی) کا طالب علم تھا اور کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد مجلس لگی اور قہوے کا دور چلا۔ مریم قہوہ دانی کو بھرنے کے لئے باورچی خانے میں اٹھ کر آئی تھی کہ وہ بھی چپکے سے چلا آیا۔

''تو تم لوگ کل چلی جاؤ گی۔'' اس نے بات شروع کی۔

''یقیناً ویسے بھی ہم وہ مہمان نہیں جو میزبان کی چاہت کے بنا ہی زبردستی رکے رہیں۔'' اس نے کمال خوبصورتی سے بسام کو اسی کی کہی ہوئی بات پلٹائی۔

''خیر وہ تو مذاق تھا۔ اچھا ہوا جو تم دونوں آ گئیں۔ امی بہت اکیلی ہو گئی تھیں مگر آج کل تو وہ بہت خوش رہتی ہیں۔''

''عمتی بہت اچھی ہیں۔ مجھے ان میں ماں کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ وہ آپ کی ماں ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔

اور بسام کھڑا سوچتا رہ گیا کہ وہ اس سے کیا کہنے آیا تھا؟ کیا واقعی وہ اس سے کچھ کہنے آیا تھا؟

2008ء کے موسم گرما میں جب لیلیٰ اور مریم اپنی پیاری پھوپھی ن کھا الوداع کہہ کر دمشق سے لوٹ رہی تھیں تو پلٹ پلٹ کر شہر پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آج کے بعد کبھی وہ اس زندہ، جیتے جاگتے اور دھڑکتے ہوئے شہر کو اس حال میں نہ دیکھ پائیں گی۔

☆.....☆.....☆

حلب واپس آتے ہی مریم نے جامعة الحلب کے ''الكلية الطب'' (میڈیسن) میں اور لیلیٰ نے ''الكلية الصحافية'' (جرنلزم) میں داخلہ لے لیا۔

صبح و شام پڑھائی کے نام ہوئے۔ وہ صبح کی گئی دوپہر بعد لوٹتی تھیں تو ڈھیروں اسائنمنٹ ساتھ ہوتے۔ باپ اپنی بیٹیوں کے چہرے دیکھنے کو ترس گئے۔ لیکن زندگی کا ایک ایسا معمول بھی تھا جو اب تک جاری تھا اور وہ تھا الاسواق القديمة میں جا کر آئسکریم کھانا۔ جمعرات کی رات وہ تینوں حلب کی سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہے ہوتے۔ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے اور بوضة شامية کھا کر گھر واپس آتے۔ پھر تاریخ کا وہ منحوس ترین دن بھی آ پہنچا جب 3 جون 2011ء ''حما'' شہر کے چوراہے پر غیر مسلح اور پرامن مظاہرین پر مسلح فوجیوں کی جانب سے کھلی فائرنگ کی گئی۔ سڑک پر گری لاشوں اور تڑپتے زخمیوں کو اٹھانے نہیں دیا گیا اور مظاہرین کے انخلا تک فائرنگ کی جاتی رہی۔ 14 جنوری 2012 کے دن بشار الاسد کی تقریر کے خلاف ''ادلب'' میں زبردست مظاہرہ ہوا اور تاریخ میں پہلی بار ڈکٹیٹر کے خلاف عوام کا غم و غصہ

منظر عام پر آ گیا ''بشار تم امریکی ایجنٹ ہو''

''تمہارے آباؤ اجداد قابل ملامت ہیں۔''

''تیار رہو قذافی کے بعد اب تمہاری باری ہے۔''

''اب انقلاب کا وقت ہے۔ اللہ ہمارا مددگار ہو''

''ہم آزاد مرنا چاہتے ہیں۔''

یہ اور اسی طرح کے نعروں سے سیریا کی فضائیں گونجنے لگیں اور اس کے بعد پر امن انداز میں چھ مہینے تک جاری رہنے والے احتجاج کو کچلنے کے لئے اسد نے ظلم و ستم کے وہ ریکارڈ بنائے کہ جس پر انسانیت نے شرم سے منہ چھپا لیا۔

☆.....☆.....☆

12 اپریل 2012 لیلیٰ کی گریجویشن کا دن تھا۔ وہ میرون رنگ کا گاؤن پہنے اور ہم رنگ اسکارف سر پر سجائے مسکراتے ہوئے اپنی ڈگری وصول کر رہی تھی۔ مریم نے ان یادگار لمحات کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کیا اور تینوں خوشی خوشی گھر واپس آئے۔ ڈگری کی وصولی کے بعد وہ اطمینان کا سانس بھی نہ لے پائی تھی کہ ابی نے اسے علاء کے رشتے کے بارے میں بتایا جو آسٹریلیا میں میل بورن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہا تھا دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات کروائی گئی اور آناً فاناً ہی نکاح ہو گیا۔ لیلیٰ کے لئے یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی اور نکاح کے ایک ماہ بعد اسے اپنے شوہر کے پاس آسٹریلیا چلے جانا تھا۔

''اب بس بھی کرو یا اُختی، کتنے آنسو گراؤ گی۔ عرب شعراء کا کہنا ہے کہ محبوب سے ملن کی گھڑی ہو تو خوشی کے آنسو گراؤ غم کے نہیں۔''

مریم نہ جانے کتنی دیر سے اسے تسلی دلاسے دیئے جا رہی تھی مگر اس کی سسکیاں تھی کہ رکنے میں نہ آئی تھی۔ پچھلے بیس منٹ میں وہ ٹشو کا ایک پورا ڈبہ ختم کر چکی تھی۔

''مگر میں تو کبھی حلب سے اکیلی باہر نہیں نکلی تو آسٹریلیا کیسے جاؤں گی؟ تم سے اور ابی سے دور کیسے رہوں گی؟ میں مر جاؤں گی مریم۔''

''کچھ نہیں ہو گا تمہیں اور اب ہمارے بارے میں سوچنا چھوڑ دو اپنے اس محبوب کے بارے میں سوچو جو جون کی سردرات میں ایئر پورٹ پر تمہارے ہاتھوں کا بوسہ لینے کے لئے کھڑا ہوا ہو گا۔'' مریم نے اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ایک آنکھ دبا کر کہا تو وہ روتے روتے ہنس پڑی۔

''یا لیلیٰ! کُونی شجاعة (بہادر بنو) تمہاری رگوں میں عرب خون ہے اور عرب عورت آنسو گرانا نہیں جانتی۔ میں کہتی ہوں کہ اگر صلاح الدین کی ماں اور بیوی ایسے ہی آنسو گراتیں تو ہو گئی تھی ارض مقدسہ فتح۔''

وہ فنجان میں قہوہ ڈالتی ہوئی بولی اور اپنی بہن کو پیش کیا۔ لیلیٰ نے پہلا گھونٹ لیا اور پھر شروع ہوئی۔

''سوچتی ہوں کہ ابی کا کیا ہو گا۔ اب ان کی عمر خود کام کرنے کی نہیں رہی۔ انہیں وقت پر کھانا کون دے گا۔ تم تو لمبی لمبی ڈیوٹیز پر ہوتی ہو۔''

جب اس نے اپنی ساری ذہنی الجھنیں مریم کے سپرد کر دیں تو وہ بہن کا کندھا تھپتھپا کر بس اتنا ہی بولی۔

''اب جاؤ۔ اور بے فکر ہو کر جاؤ۔ تمہارے شوہر کے گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔ ابی کے لئے میں کافی ہوں۔ واللہ! ان کے معاملے میں میں تمہارے اور اپنے رب کے آگے کبھی شرمندہ نہ ہوں گی۔ ان شاءاللہ۔''

''ان شاءاللہ۔'' لیلیٰ نے تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مریم ہمیشہ ہی سے عزم و ہمت کا پیکر تھی پھر وہ جو بات کہتی اسے کر کے ہی دکھاتی۔

تیسرا باب

جب شام لہو رنگ ہوا

پندرہ جنوری 2013ء کا دن بھی دوسرے دنوں ہی کی طرح تھا۔ آج اس کی پوری کلاس وقت سے پہلے ہی یونیورسٹی پہنچی تھی۔ کلیہ طب کے زیر انتظام ایک کانفرنس منعقد کی جا رہی تھی جس میں سیریا کی بگڑتی صورتحال میں شعبہ طب سے وابستہ افراد کی مشکلات زیر بحث لائی جانی تھیں۔ یونیورسٹی میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی کہ مقامی اور بین الاقوامی پریس کے نمائندوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔

''اُختی مریم! السلام علیکم۔ کیف

اسے پیچھے سے آواز آئی تو اس

آنے والی کو دیکھا۔ یہ دوسرے سال کی

ٹکراتی رہتی اور اپنے مسائل ڈسکس کر

وہ بولی۔

''اُختی مریم مجھے اناٹومی میں

تھوڑا وقت نکال کر سمجھا دیں۔ واللہ!

طرح لگتی ہیں۔ بتایئے آپ انکار تو نہیں

مریم کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اس

''اجیبی! ھل تساعدینی؟

؟) مریم جو معذرت کے لئے جملہ سوچ

ہنس پڑی اور بولی:

''اکید۔ انا اساعدك یا رغد

اس کی کلاس روم نظر آئی تو وہ مڑ

جانب بڑھ گئی جہاں اسے انتظامات کا جا

مصروف تھی جب پہلا زوردار دھماکہ ہوا پو

اکبر کی دل دہلا دینے والی آوازیں سنائی د

شور مچا۔

دھکم پیل کی کیفیت میں وہ بھی دو

بیرونی جانب بھاگ رہی تھی کہ رغد کی کلا

بھاری بھرکم ڈیسک اس کی کمر پر پڑی۔

ہوئی اسے سرکانے کی کوشش کر رہی ہے۔

رغد کی جانب دوڑ رہی تھی۔ لیکن اس

دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی سیکنڈ ائیر

مریم لڑکھڑائی اور پھر اسے کچھ پتہ نہ چلا

گیٹ تک لایا۔

یہ جامعة الحلب پر اسدی

یونیورسٹی کو ہی ہدف بنا کر کیا گیا تھا۔

''اُختی مریم! السلام علیکم۔ کیف انت یا مریم؟''

اسے پیچھے سے آواز آئی تو اس نے مسکرا کر تیز قدموں سے چلتی آنے والی کو دیکھا۔ یہ دوسرے سال کی طالبہ رغد تھی۔ مریم سے اکثر ہی ٹکراتی رہتی اور اپنے مسائل ڈسکس کرتی رہتی تھی۔ خیر خیریت کے بعد وہ بولی۔

''اُختی مریم مجھے اناٹومی میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔ آپ تھوڑا وقت نکال کر سمجھا دیں۔ واللہ! مجھے آپ بالکل اپنی بڑی بہن کی طرح لگتی ہیں۔ بتایئے آپ انکار تو نہیں کریں گی؟''

مریم کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اس نے ملتجی نظروں سے دیکھا۔

''اجیبی! هل تساعدینی؟'' (کہیے آپ میری مدد کریں گی؟) مریم جو معذرت کے لئے جملہ سوچ ہی رہی تھی اس کے اس انداز پر ہنس پڑی اور بولی:

''اکید۔ انا اساعدك یا رغد'' (ضرور کیوں نہیں)

اس کی کلاس روم نظر آئی تو وہ مڑ گئی اور مریم یونیورسٹی آڈیٹوریم کی جانب بڑھ گئی جہاں اسے انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ مصروف تھی جب پہلا زوردار دھماکہ ہوا پورا ہال لرز اٹھا۔ ہر طرف سے اللہ اکبر کی دل دہلا دینے والی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر برّا برّا (باہر نکلو) کا شور مچا۔

دھکم پیل کی کیفیت میں وہ بھی دوسرے طلبا کے ساتھ راہداری سے بیرونی جانب بھاگ رہی تھی کہ رغد کی کلاس نظر آئی مریم نے دیکھا کہ ایک بھاری بھرکم ڈیسک اس کی کمر پر پڑی ہے اور وہ ہذیانی کیفیت میں چیختی ہوئی اسے سرکانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مریم رک گئی دوسرے ہی لمحے وہ رغد کی جانب دوڑ رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ پہنچتی دوسرا زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی سیکنڈ ائیر کی کلاس روم کی چھت گر پڑی۔

مریم لڑکھڑائی اور پھر اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا گیٹ تک لایا۔

یہ جامعة الحلب پر اسدی فوج کا براہ راست حملہ تھا جو یونیورسٹی کو ہی ہدف بنا کر کیا گیا تھا۔

خوف اور دہشت کی جس فضا سے نکل کر وہ گھر پہنچی وہ آنے والے سنگین ترین دور کا محض ایک تعارف تھا۔ اس پہلے تجربے نے اس کے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ ایمبولینس کے متواتر بجتے سائرن، زخمیوں کی دلدوز چیخوں اور ہر طرف خون کے مناظر جو اب اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ بننے جا رہے تھے یہ تو اس کا ایک ٹریلر ہی تھا۔

وہ گھر آ کر کتنی ہی دیر ابی کی گود میں منہ دیئے روتی رہی اس کے کانوں میں رغد کی بے بس سی آواز سنائی دیتی۔

''هل تساعدینی؟ یا مریم؟''

''هل تساعدنی''..... ''اکید۔ انا اساعدك.....''

وہ ایک اور تجربے سے آج کے دن گزری تھی۔ حد سے زیادہ بھیانک اور خود غرضی کی حد تک بے حسی کا تجربہ..... اپنے آس پاس کراہتے انسانوں کو چھوڑ چھاڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے کا تجربہ۔ اس تجربے کو بھی آئندہ کی زندگی میں اس کا معمول بننا تھا۔

☆.....☆.....☆

''ہاں لیلیٰ کیسی ہو؟'' وہ تھکن سے چور آواز میں بولی تو لیلیٰ کی جان میں جان آئی۔

''میں کب سے فون پہ فون، میسج پہ میسج کیے جا رہی ہوں۔ تم اٹھاتی کیوں نہیں ہو۔ حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں تم فون نہیں اٹھاتیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔''

وہ گھٹنوں سے روکے ہوئے غصے اور فکرمندی کو مریم پر نکال کر خود ہی آبدیدہ ہو گئی تھی۔

''آج کیمپ وزٹ کا دن ہوتا ہے۔ وہاں میں سیل بند رکھتی ہوں۔ بتایا تو تھا تم کو۔ مہلت بھی نہیں ملتی اور میں خود بھی باہر کی دنیا سے رابطے کاٹ لینے میں سکون محسوس کرتی ہوں۔''

وہ اداسی سے بولی اور پھر اس نے دھیرے دھیرے قہوے کے گھونٹ لیتے ہوئے لیلیٰ کو دن بھر کی روداد سنائی۔

''ہم جتنی دوائیں، جتنی ایمرجنسی میڈیسن اور پانی کی بوتلیں لے جاتے ہیں دوپہر تک ختم ہو جاتی ہیں اس کے بعد ہم ہر آنے والے

مریض کو بس خالی خولی تسلیاں ہی دیتے ہیں۔''

''تمہیں بتاؤں لیلیٰ میں نے کلینک میں ہی اسکول بھی کھول لیا ہے۔ بورڈ رکھ لیا ہے اور کتابیں ہر دفعہ اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ پھر ساتھ ہی واپس لے آتی ہوں۔ وہاں موجود بچے اسکول جاتے تھے مگر اب اس طرح اجنبی نگاہوں سے کاپی پنسل کو دیکھتے ہیں کہ میرا دل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ کوئی پوچھتا ہے ہمارا اسکول کب کھلے گا؟ کوئی کہتا ہے میرا بستہ وہیں گھر میں رہ گیا مجھے نیا بستہ چاہیے۔ ایک بچی نے مجھے کہا کہ اسے اپنا ڈورا والا پنسل کیس بہت یاد آتا ہے۔''

''اف مریم! اتنی بھیانک زندگی؟ اتنا برا تو ہم نے خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ لیلیٰ نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

''یا اُختی! ہمارے خوابوں میں تو سنڈریلا اپنی فرل فراک کیساتھ آیا کرتی تھی مگر یہ بچے تو سارے خواب ہی لٹا چکے ہیں۔ کل میں نے کلاس ختم کر کے سب کو کپ کیک دیا وہ جب کھانے پر جھپٹتے ہیں تو بڑا دکھ ہوتا ہے یہ ان ہی گھروں کے بچے ہیں جن کی میزوں پر ایک وقت میں پندرہ کھانے موجود ہوتے تھے۔''

''ہاں! سچ کہتی ہو۔ جنگ نے سب کچھ تباہ کر ڈالا۔'' لیلیٰ کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

''میں نے سب بچوں سے پوچھا کہ وہ خواب میں کیا دیکھتے ہیں؟ ایک بچے نے کہا اپنا پرانا اسکول۔ دوسرے نے کہا اپنی ماں کو اور تیسرے نے پتہ ہے کیا کہا؟ میں دیکھتا ہوں ہر طرف آگ لگی ہے اور ہم گر رہے ہیں، لوگ مر رہے ہیں اور پھر ایک سپر مین آتا ہے اس کے پاس سپر پاور ہے اور پھر وہ سارے انسانوں کو بچا لیتا ہے۔ اس دنیا کو بچا لیتا ہے۔''

اتنا کہہ کر مریم اپنی آواز پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ لیلیٰ بھی رونے لگی۔

''پھر میں نے ان کو صلاح الدین کی کہانی سنائی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ مسلمانوں کا سپر مین ہیرو تھا اور اس نے صلیبی ظالموں سے ہمیں چھڑوایا تھا۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ سب کو صلاح الدین بننا ہوگا۔ آپ اپنے گھروں کو دوبارہ بنائیں گے۔ اسکول بنائیں گے۔ کلاسوں میں پھر سے پڑھنے جائیں گے۔ میری کہانیوں پر وہ معصوم خوش ہو جاتے ہیں۔

مگر مجھے لگتا ہے کہ کل جب وہ اس سے بھی برے حالات کا سامنا کریں گے تو میری باتوں پر سے، مجھ پر سے انکا اعتبار اٹھ جائے گا۔ وہ سوچیں گے کہ یہ اچھی باتیں سب جھوٹ ہیں۔ ہمارے حصے میں صرف موت ہی موت ہے۔''

''تم اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہو مریم۔ ہمیشہ تو تم امید ہی کی باتیں کرتی ہو۔''

''لیلیٰ! کہاں سے لاؤں امید؟ بتاؤ کہاں سے لاؤں۔ تمہیں بتاؤں گی تو یقین نہیں کرو گی کہ تیرہ چودہ برس کی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا؟'' لیلیٰ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''دلالی..... مردوں عورتوں کا ایک گینگ اپنا کاروبار جمائے بیٹھا ہے۔ آس پاس کے مسلم ممالک کے عیاش باقاعدہ ڈیل کر کے یہاں آتے ہیں۔ یہاں وہ لڑکی پسند کرتے ہیں نکاح ہوتا ہے اور مہر کی رقم خاندان کے حوالے کر کے لڑکی لے جاتے ہیں..... پھر کچھ عرصہ بعد اس کا حشر خراب کر کے طلاق کا کاغذ پکڑا کر واپس کیمپ میں پھینک جاتے ہیں۔''

''یا ربی! یا مریم کیا کہہ رہی ہو؟''

''خود مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا مگر کرنا پڑا۔ جھیل جیسی آنکھوں والی فاطمہ سے میں نے پوچھا کہ تمہارے ماں باپ نے پچاس سال کے مرد سے تمہیں کیوں بیاہ دیا تو سکون سے کہنے لگی کہ تین ہزار ریال کے لئے۔ اور اب وہ جسم پر تشدد کے نشانات لیے والدین کے پاس واپس آ گئی ہے اگلے شہزادے کے انتظار میں..... میں تمہیں کیا کیا سناؤں۔ کبھی جو عزتوں کے رکھوالے ہوتے تھے انہیں ہوس نے اندھا کر دیا ہے اب وہ اپنی ہی بہنوں کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔''

کچھ لمحہ خاموشی سے گزر گیا تو لیلیٰ کی آواز ابھری۔

''وہ..... مریم..... تم سے ایک بات کہنا تھی۔ برا نہ منانا۔'' اس

نے تردد سے کہا تو مریم ٹھٹکی۔

''ہاں کہو۔''

''بہت سے لوگ یورپ کا رخ کر رہے ہیں۔ میں یہاں سے ویزے کی کوشش کرتی ہوں تم اور ابی میرے پاس آجاؤ۔ یا کہیں اور.....''

''نہیں لیلیٰ..... فرار نہیں..... میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ میں اور ابی اپنا حلب چھوڑ کر کہیں جانے والے نہیں۔ ابی کی بھی یہی مرضی ہے اور پھر ان بے گناہ، بے گھر، تڑپتے سسکتے لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ میں نے مسیحائی کا ہتھیار اٹھایا ہوا ہے لیلیٰ اور تم کہتی ہو کہ اپنے مریضوں کو چھوڑ کر میں ہتھیار رکھ دوں اور فرار اختیار کرلوں؟ اس بھیڑیے کی فوج سے ڈر جاؤں جو اپنے ہی گلے کے گلے کاٹ رہا ہے..... نہیں لیلیٰ! یہاں حالات غیر یقینی ہیں اور مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم مجھے ہمت دلایا کرو..... للہ میرے قدموں کو کمزور مت کرنا۔''

اور دوسری جانب موجود لیلیٰ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ مریم ہی کیا جو ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد اسے آخری دم تک نہ نبا ہے سو وہ خاموش ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

لیلیٰ گھر کے نزدیک پہنچی تو اس کا وائی فائی کنکشن بحال ہوا اور دھڑا دھڑ میسج کی ٹون بجنے لگی۔

وہ گاڑی پارک کرتے ہی گھبرا کر اتری اور جب مریم کے میسج باکس پر ہرے رنگ سے چالیس کا ہندسہ جگمگایا تو اس نے بے اختیاری میں ستون تھاما۔ اندیشوں کا ایک طوفان اس کے اندر تھا۔ اس نے کانپتی انگلیوں اور ہونٹوں سے پھسلتے۔ دعائیہ کلمات کے ساتھ واٹس اپ کھولا۔ اور پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

''لیلیٰ..... بہت افسوسناک خبر ہے۔''

''ویسے اب میں صرف بری خبریں ہی سناتی ہوں۔ اچھی خبر تو خواب بن گئی۔''

''الا سواق القديمة پر بمباری ہوگئی۔''

''لیلیٰ..... ہمارا بچپن تباہ کر دیا۔ انہوں نے سب تباہ کر دیا بوضة شامية کھنڈروں کا ڈھیر بنا دیا۔''

''ایک ایک کر کے یہ ہمارے شہر سے زندگی کا خاتمہ کر رہے ہیں۔''

اور لیلیٰ آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے وہیں زمین پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ بچپن میں پرانے بازار جانا، گلیوں میں مریم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومنا، غباروں کے پیچھے بھاگنا، ہاتھوں پر طوطے کو بٹھا لینا، مسالوں کی مانوس سی مہک، لوگوں کے قہقہے اور کلیجے میں ٹھنڈ بن کر اترتی ہوئی آئسکریم..... سب ایک آن میں بھسم کر دیا گیا تھا اور جنہوں نے کیا تھا وہ جانتے بوجھتے کر رہے تھے اور جو روک سکتے تھے وہ جانتے بوجھتے ہوئے انہیں ایسا کرنے دے رہے تھے۔ حلب جل رہا تھا..... عالمی میڈیا سو رہا تھا۔ عالمی فیصلوں کے ایوانوں میں موت کی خاموشی طاری تھی۔

دو طرفہ سودے بازی تھی۔ دونوں طرف کے اسلحہ برداروں کو اسلحہ کی فراہمی جاری تھی تاکہ کہیں اسلحے کی عدم فراہمی سے تباہی کا عمل سست نہ پڑ جائے۔ عالمی سماج کی طرف سے جنگ بندی کی کسی کوشش کا ہلکا سا اشارہ بھی نہ آیا تھا۔ سو جو ہو رہا تھا، ہوتا گیا

☆.....☆.....☆

حلب میں رہنے والوں کی زندگی شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے محلے میں ہفتے میں ایک بار واٹر ٹینکر آتا تھا جس میں سے لائن میں لگ کر پانی کا ڈبہ بھرا جاتا تھا۔ یہی پانی سارا ہفتہ چلانا پڑتا۔ جس حصے میں ان کی رہائش تھی وہ اپوزیشن کنٹرول کا علاقہ تھا لہٰذا حکومت کی جانب سے بار بار بجلی کی سپلائی بند کر دی جاتی۔ اس آنکھ مچولی کے عرصے میں جب اس کا وائی فائی کنکشن کھلتا تو وہ فوراً ہی دو کام کرتی تھی۔ پھوپھی اور لیلیٰ کو خیریت کا میسج اور اپنے فیس بک پر حلب کے حالات کی مختصر روداد ڈال دیتی۔ اس وقت تک اسے امیدیں تھیں۔ اسے امید تھی کہ الیکٹرانک میڈیا میں بائیکاٹ ہونے کے باوجود سوشل میڈیا جو کچھ دکھا رہا ہے اس سے ایک نہ ایک دن عالمی ضمیر یا مسلم ممالک کی حکومتیں ضرور جاگیں گی۔ اسے مدد کی امید تھی۔ دوسرے ہم وطنوں کی طرح اس

نے بھی سالہا سال تک اپنی امیدوں کو جگائے رکھا تھا۔

چھٹی کے دونوں دنوں میں وہ صبح سے کیمپ کی طرف نکل جاتی وہاں کے اعصاب شکن حالات اسے بالکل ہی توڑ دیتے تھے۔ واپس آکر وہ ابی کے پہلو میں بیٹھ کر خوب آنسو بہاتی..... ابی بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے۔ ان کے پاس ہمیشہ حکمت کا کوئی نہ کوئی نکتہ اور ایمان کو مضبوط کرنے والے الفاظ موجود ہوتے تھے۔ اکثر وہ اسے پاس بٹھا کر قرآن کی آیات کے ذریعے امید دلاتے۔ جنت کے انعامات کا تذکرہ کرتے اور اس کی کوششوں کو سراہتے تب وہ بچوں کی طرح خوش ہو جاتی اور تازہ دم ہو کر محاذ پر ڈٹے ہوئے سپاہی کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی۔ کسی دن وہ تھک کر ابی کی لائبریری میں بھی پناہ لیتی اور کسی کتاب میں کھو کر لمبے سفر پر نکل جاتی۔ وہ حلب کو بھول کر مجاہدین کے گھوڑے پر سوار ہو جاتی۔ اور اب جبکہ اپنے اطراف موت و زیست کا قریب سے مشاہدہ کر رہی تھی، اسے جہاد اور شہادت کے فلسفے کی نئی جہتیں اور حکمتیں سمجھ آنے لگی تھیں۔ واقعی کوئی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجاہدین کے جذبات کو کس طرح سمجھ سکتا ہے۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

جنت ہمارا آبائی وطن

از: بشریٰ تسنیم

قیمت: 50 روپے

ادارہ بتول F-14 سید پلازہ 30 فیروز پور روڈ لاہور
042-37424409

قرآن و حدیث کی روشنی میں نئے علوم سے استفادہ کرتے ہوئے جدید مسائل کو سلجھانے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہم کیسے رہیں

نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

از: ابن فرید

قیمت -/140 روپے

آج ہی اپنے آرڈر سے مطلع کریں

ملنے کا پتہ: ادارہ بتول F-14 سید پلازہ 30 فیروز پور روڈ لاہور۔ فون: 042-37424409

ہم ایسی تحریریں شائع نہیں کرتے!

☆.....جن میں آیات، احادیث اور اقوال کے حوالے موجود نہیں ہوتے۔

☆.....جن کا مواد ہمارے کالموں کے مطابق نہیں ہوتا۔

☆.....جن میں املا اور گرائمر غلط ہوتی ہے۔

☆.....جن کی لکھائی پھیکی، خراب اور شکستہ ہوتی ہے۔

☆.....جو صفحے کے دونوں جانب لکھی گئی ہوتی ہیں۔

☆.....جو ہمارے کالم کی مطلوبہ طوالت سے زیادہ ہوتی ہیں۔

☆.....شاعری ہے تو شعری پیمانوں کے مطابق نہیں ہوتی۔

☆.....لکھنے والے کا اصل نام، مکمل پتہ اور فون نمبر موجود نہیں ہوتا۔

''بتول'' آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اس کا معیار برقرار رکھنے میں ہمارے ساتھ تعاون کیجیے۔